جولائی + اگست ۱۹۹۶

لیکن مجھے اعماق سیاست سے ہے پرہیز

احمد جاوید

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

پچھلے چالیس برس سے ہمارا اجتماعی شعور چیزوں کو محض ایک سیاسی تناظر میں دیکھنے کا عادی ہوچکا ہے جسے ہم نے ان قوموں سے اخذ کیا ہے جو ہماری نظر میں ترقی یافتہ ہیں۔ جن اقوام سے یہ بیماری ہمیں لگی تھی' وہ کب کی شفایاب ہوچکی ہیں۔ ۷۰ء کے بعد سے یورپ اور امریکا میں اس Politicism کا خاتمہ ہو چکا ہے جو ایک ادھوری' تنگ اور اتھلی حالت میں اب تک ہم پر مسلط ہے۔ زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح سیاست میں بھی ہم ارادہ و شعور کی نصب العینی کلیت اور عملی معاملات کو کسی بڑے وژن اور مقصد سے ہم آہنگ رکھنے کی صلاحیت سے بڑی حد تک محروم ہوچکے ہیں۔ جس عالمی صورت حال کا ہم ایک حصہ ہیں یا بننے والے ہیں' اس کے ادراک کے لیے محض اخبار پڑھ لینا اور بی۔ بی۔ سی سن لینا کافی نہیں۔ اس طرح کچھ واقعات کی اطلاع تو مل جاتی ہے لیکن ان کے پیچھے ہر آن متغیر محرکات کی جو تیز رو چل رہی ہے' وہ گرفت میں نہیں آتی۔ بلکہ آ بھی نہیں سکتی کیونکہ اس کا سوتا جس لاتاریخی۔ لاانسانی' انتشار سے پھوٹتا ہے' اسے سمجھنے یا سمجھ سکنے کا انسانیت کو کوئی تجربہ نہیں۔

اقبال نے کہا تھا: "جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی"۔ اس زمانے میں کہ جب سیاست' تغیرات میں کسی اٹل نظریے کی بنیاد پر ایک تنظیم پیدا کر کے انسان کی اس انتظامی صلاحیت کے تابع رکھنے سے عبارت تھی جو دنیاوی زندگی میں تحفظ' آزادی اور راحت و آسائش کے ممکنہ اسباب فراہم کرنے کی ذمہ دار ہے' اس مصرعے کا مطلب یہ تھا کہ سیاست کے سر پر سے دین کا آسماں ہٹ جائے تو بے سمت تغیر کا کوئی رخ متعین کرنے کے بجائے آدمی خود اس کا سب سے بڑا مظہر بن جاتا ہے۔ چنگیزی کیا ہے؟ جس طرح فطرت اپنی بے مہار 'انا' کا اظہار بے ہدف تغیرات کی صورت میں کرتی ہے' انسانی 'انا' بھی ہر قید سے نکل جائے تو سرکش باڑھ بن جاتی ہے جس کے آگے کوئی چیز اپنے اس ساکن تعین کے ساتھ برقرار نہیں رہ سکتی جو کائنات کے لایعنی بکھراؤ میں اس کی تمام تر وجودی معنویت کی اساس ہے۔ دین اسی ساکن تعین کی ربانی اصل ہے جس سے لاتعلق ہو کر ہمارے ائمہ سیاست تعلیم' دفاع' ترقی' جمہوریت — تو میں کو اس کا متبادل بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

اپنے ایک مضمون "فلسفہ سخت کوشی" میں اقبال لکھتے ہیں: "میرے نزدیک بقا' انسان کی بلند ترین آرزو اور ایسی متاع گراں مایہ ہے جس کے حصول پر انسان اپنی تمام قوتیں مرکوز کر دیتا ہے۔"(۲) حصول بقا کے لیے دو باتیں لازمی ہیں۔ مراتب ہستی کے حقیقی و خوف کے ساتھ اپنے سے بلند درجات کے سامنے انفعال و مغلوبیت اختیار کرنا اور نیچے کی سطحوں پر غالب آنا۔ انسان کی تمام سرگرمیوں کی طرح سیاست کو بھی اسی محور پر گھومنا چاہیے ورنہ اس کا اور اس کے تمام اداروں کا کوئی جواز نہیں۔ ایک دینی معاشرے میں اس کی ہر جہت اسی غیر متغیر اصول پر استوار ہونی چاہیے کہ 'دنیا ہماری ہے اور ہم خدا کے' جب کبھی ایسا وقت آیا کہ یہ 'دنیا ہماری ہے' پر تو ڈٹی رہی مگر ہم خدا کے ہیں' سے منکر ہوگئی تو چنگیزی بن گئی۔ یہاں اقبال کے ذوق کی رعایت سے یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ چلو چنگیزی میں بھی کائنات پر انسان کے غلبے کا ایک پہلو تو پایا جاتا تھا' ہم تو چنگیزی کے قابل بھی نہیں رہے۔ اپنا تو یہ حال ہے کہ 'خدا ہمارا ہے اور ہم دنیا کے'—

آبروے زندگی درباختہ

چوں خراں باکاہ وجو درساختہ (۳)

آج کل اکیسویں صدی کا ڈھنڈورا پٹ رہا ہے' ایک شور سا مچا ہوا ہے' اس کی حقیقت کیا ہے' اگلی صدی یقیناً ترقی و خوشحالی کی صدی ہوگی— اور اگر ہم نے ذمہ داری کا مظاہرہ کیا یعنی کسی نیلی یا پیلی پارٹی کو اقتدار دے دیا تو زیادہ سے زیادہ اس کے عشرۂ اول کے آخر تک ہمارا ملک' جاپان ورنہ کوریا تو ضرور بن جائے گا' مگر جاپان یا کوریا بننے کے لیے جن چیزوں کی قربانی درکار ہے' وہ ہم دے سکیں گے؟ مثلاً دین اور اس کی بنیاد پر وجود میں آنے والے تہذیبی اوضاع — ترقی یافتہ اقوام نے ترقی کی ہر راہ متعین کر دی ہے۔ ہم مر بھی جائیں تو ان مقاصد تک پہنچنے کی کوئی نئی ڈگر نہیں نکال سکتے جو ہم نے انہی قوموں سے اخذ کیے ہیں۔ اس وقت روئے ارض پر ہماری مطلوبہ ترقی کی حامل کوئی ایک قوم بھی ایسی موجود نہیں جو یہاں تک اپنے دین اور دینی طرز احساس سے مکمل طور پر دست بردار ہوئے بغیر پہنچی ہو— ایسی ترقی اور مسلمانی' خواہ وہ اقبال ہی کی کیوں نہ ہو' یکجا نہیں ہو سکتی۔ جس دروازے سے ہم اکیسویں صدی میں داخل ہونا چاہتے ہیں اس کی کنجی جس ہاتھ میں ہوگی وہ بہرحال دست دعا نہیں ہوگا۔ وہ طبقہ جو زندگی کے تقریباً تمام شعبوں میں اقتدار کی مسند پر براجمان ہے' اس کی نظر میں یہ کوئی مسئلہ نہیں۔ یہ تو ترقی کی معمولی قیمت ہے' ہم البتہ ہچکچا رہے ہیں۔ ایک ہلکی سی کھٹک ہمیں یہ معمولی سی قیمت دینے پر بھی راضی نہیں ہونے دے رہی۔ خدا اقبال کا بھلا کرے' یہ کھٹک انہی کی پیدا کردہ

ہے۔ اقبال کے ساتھ ہمارا تعلق برائے نام سہی مگر (مشکل یہ ہے کہ) ابھی پوری طرح ختم نہیں ہوا۔ مرد مومن، خودی، اطاعت، فقر، نیابت الہیہ، روحانی جمہوریت وغیرہ ہمارے لیے کسی گم شدہ زبان کے کلمات ہیں مگر کیا کیجئے کہ ان کے معنی نہ جاننے اور اپنے آپ کو ان کے اثرات سے بڑی حد تک محفوظ رکھنے کے باوجود ہم کسی نہ کسی طرح ان کی زد میں آ ہی جاتے ہیں۔ یہ الفاظ اجنبی ہو کر بھی تاثیر دکھا جاتے ہیں۔ اس کا سبب ہماری قومی نفسیات کی باقیات میں پوشیدہ ہے۔

اسلام کی بنیادی ترکیب میں تاریخیت ایک اہم عنصر ہے جس کی وجہ سے مسلمانوں کے لیے ماضی ہمیشہ ایک زندہ بلکہ حال اور مستقبل پر غالب حقیقت کی حیثیت سے موجود رہا ہے۔ اس لیے زمان و مکاں اور عروج و زوال کے بارے میں ان کے تصورات کو کسی بیرونی حوالے سے نہیں سمجھا جاسکتا۔ ان کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے یا تھا کہ 'اسلام من حیث الکل' کے تاریخی تواتر کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ آنے دی جائے۔ وہ رکاوٹ چھوٹی ہو کہ بڑی، مقامی ہو کہ کائناتی —— یہی وہ روح ہے جو انہیں زمانے کی ہر لہر میں بہ جانے سے روکتی ہے، خواہ ان کو پورا یقین ہو کہ یہ لہر ہمیں خوش حالی اور آسودگی کے ساحلوں تک لے جائے گی۔ اقبال کے ہاں یہ اصول کئی طرح سے بیان ہوا ہے مثلاً:

اگر ملک ہاتھوں سے جاتا ہے جائے تو احکام حق سے نہ کر بے وفائی (۴)

یہ کافری تو نہیں، کافری سے کم بھی نہیں
کہ مردِ حق ہو گرفتارِ حاضر و موجود (۵)

یہ بندگی خدائی، وہ بندگی گدائی
یا بندۂ خدا بن، یا بندۂ زمانہ (۶)

یادِ عہدِ رفتہ میری خاک کو اکسیر ہے
میرا ماضی میرے استقبال کی تفسیر ہے
سامنے رکھتا ہوں اس دورِ نشاط افزا کو میں
دیکھتا ہوں دوش کے آئینے میں فردا کو میں (۷)

پھر سیاست چھوڑ کر داخل حصار دیں میں ہو
ملک و دولت ہے حفظ حرم کا اک ثمر (۸)

دیں ہاتھ سے دے کر اگر آزاد ہو ملت
ہے ایسی تجارت میں مسلماں کا خسارا (۹)

شکوہ سنج سختی آئیں مشو
از حدود مصطفیٰ بیروں مرو (۱۰)

"جماعت مسلمین کا زندہ رکن بننے کے لیے انسان کو مذہب اسلام پر بلاشرط ایمان لانے کے علاوہ اسلامی تہذیب کے رنگ میں اپنے تئیں پوری طرح سے رنگنا چاہیے۔ صبغۃ اللہ کے اس خم میں غوطہ لگانے کا مدعا یہ ہے کہ مسلمان دورنگی چھوڑ کر یک رنگ ہو جائیں۔ ان کا ذہنی منظر ایک ہو' وہ مظاہر آفرینش پر ایک خاص پہلو سے نظر ڈالیں۔ اشیا کی ماہیت اور قدرو قیمت کو اس انداز خاص کے ساتھ جانچیں جو جماعت اسلامی اور دوسری جماعتوں کا مابہ الامتیاز ہے اور جو مسلمانوں کو ایک غایت مختصہ و مقصد معینہ کے پیرایے سے آراستہ کر کے انہیں "کل مومن اخوۃ' کی کتاب کے اوراق بنا دیتا ہے۔۔۔۔" (۱۱)

"۔۔۔۔ ہم نے کس قسم کے تعلیم یافتہ اشخاص تیار کیے ہیں؟ آیا ان اشخاص کی قابلیت ایسی ہے کہ ہم مسلمانوں کی سی مختص الترکیب جماعت کی عمرانی ہستی کے تسلسل کی کفیل ہو سکے؟" (۱۲)

"ہماری قومی سرگرمیوں کی محرک اقتصادی اغراض ہی نہیں ہونی چاہئیں۔ قوم کی وحدت کی بقا اور اس کی زندگی کا تسلسل' قومی آرزوؤں کا ایک ایسا نصب العین ہے جو فوری اغراض کی تکمیل کے مقابلے میں بہت زیادہ اشرف و اعلیٰ ہے۔" (۱۳)

سرسید سے اقبال تک برصغیر کے مسلمان جس صورت حال سے دوچار تھے' اس میں ان کی دینی بقا کا مسئلہ بہت شدت کے ساتھ موجود نہیں تھا۔ عالم اسلام میں اپنے دین کے ساتھ وابستگی

کا وہ پھیلاؤ، مضبوطی اور گرم جوشی شاذ تھی جو ہندی مسلمانوں کا خاصہ تھا۔ اسلام اپنی علمی و عملی دونوں جہتوں میں یہاں اس متنائی شان کے ساتھ موجود تھا جس سے آزاد مسلم ممالک بھی محروم تھے اور پھر یہ فخر بھی انہی کے حصے میں آیا کہ ایک لمبے عرصہ غلامی میں اسلام سے دست کشی تو کجا، الٹا اس کے پھیلاؤ میں اضافہ کرتے رہے۔ یہ وہ امتیاز ہے جس کی نظیر ان کے سوا کہیں نہیں ملتی۔ ورنہ ترکمان سخت کوش اور مجاہد ترکی کا جو حشر ہوا اسے دیکھنے کے لیے نئی آنکھیں بنوانے کی ضرورت نہیں ـــــ تاہم ان باتوں کا یہ مطلب نہیں کہ اس وقت سب ٹھیک تھا۔ غلامی خود ہزار لعنتوں کی ایک لعنت ہے، مگر ہمارے ساتھ مصیبت یہ ہے کہ ہم اس لعنت کو سیاسی و معاشی حوالے سے زیادہ دیکھتے ہیں اور دینی نقطہ نظر سے کم۔ اسی لیے ہماری آزادی کی اکثر برکتیں، ہمارے چاہنے نہ چاہنے سے قطع نظر، دنیا طلبی کے افق سے طلوع ہوئی ہیں۔ جبکہ غلامی اور اسلام اس لیے ایک دوسرے کی ضد ہیں کہ زندگی اور اس کے تمام پہلوؤں کو اپنے تحت رکھنے کے لیے موانع کی اختیاری بالادستی بھی اسلام کے لیے ناقابل قبول ہے، جبکہ غلامی ـــــ ہلکی ہو یا سخت ـــــ مجوزات و ممنوعات کے ایک الگ نظام کی پابندی کا نام ہے۔ اگر وہ نظام، اسلام کے کسی محدود نظام کی اجازت دے دیتا ہے تو بھی مسلمان کی غلامی کی نوعیت نہیں بدلے گی۔ کیونکہ اسلام، رعایت نہیں، مطلق حکومت چاہتا ہے۔ ملک بھی اللہ کا اور حکم بھی اللہ کا۔ غلامی و آزادی کی ہر تعریف اسی قول فیصل سے متعین ہوگی۔ یہ ہے تو ہم آزاد ہیں ورنہ غلام۔ دنیا کے نقشے میں دو انچ جگہ گھیر کر اپنی آزادی پر ایمان لے آنا سادہ لوحی ہے۔ حصول پاکستان ہماری منزل نہیں، منزل کی طرف اٹھنے والا پہلا قدم ہے، ہم اس جملے پر ذرا سا بھی غور کر لیتے تو اپنے ماضی قریب کی تاریخ کو اس طرح ناک سکوڑ کر نہ دیکھتے۔ اس وقت کے مسلمانوں کا تاریخی شعور بھی ہم سے کہیں زیادہ تھا کیونکہ اس کی بنیاد اس دینی رچاؤ پر تھی جو پوری زندگی کو ارضیت اور اس کے مظاہر سے بلند کر دیتا ہے۔ تاریخ کے منفی بہاؤ پر بند باندھنے کی طاقت نہ ہو تو قومیں اپنی بقا کے لیے ان عناصر کو تعلیمی، تہذیبی بلکہ روزمرہ کی معاشرتی سطح پر بھی محفوظ رکھنے کی کوشش کرتی ہیں جو ان کے مجموعی تشخص اور قومی وجود کی اساس ہیں۔ جو قوم ایسا نہیں کرتی، فنا ہو جاتی ہے۔ اور فنا کی یہ تلوار غلاموں ہی پر نہیں، ہم ایسے آزاد مردوں پر بھی گر سکتی ہے۔ ہمارے آباء و اجداد غلامی کے باوجود اس امتحان سے سرخرو نکلے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت خود پاکستان ہے۔ ہمیں باریک بینی کے ساتھ ان کی اس حکمت عملی کا جائزہ لینا ہوگا جس کی وجہ سے ہندوستان مسلمانوں کے ایک بڑے حصے کے لیے وسط ایشیا بننے سے محفوظ رہا۔ یہ اتنا ضروری ہے

کہ ہم اس کے لیے سانس لینا بھی موخر کر سکتے ہیں۔

اب غلبہ و مغلوبی کے مظاہر بدل چکے ہیں۔ تاریخ کا نو آبادیاتی دور ختم ہو چکا ہے۔ آج کی صورت حال یہ ہے کہ کوئی قوم سو پچاس سال پہلے کے مفہوم میں غلام بننا بھی چاہے تو نہیں بن سکتی۔ اس کی خاطر حصول آزادی سے زیادہ جدوجہد کرنی پڑے گی اور وہ بھی لاحاصل۔ بڑی طاقتوں نے ملک فتح کر کے ان پر حکومت کرنے کی روایت ترک کر دی ہے۔ اس کی ضرورت بھی نہیں رہی کیونکہ انہوں نے دو ڈھائی سو برس تک کامل یکسوئی کے ساتھ جو 'عمل تسخیر' کیا ہے' اس کے نتائج تیزی سے سامنے آتے جا رہے ہیں۔ جس کی طرف منہ کر کے چھو کر دیں' رام ہو جاتا ہے۔ پھر انہیں کیا پڑی ہے کہ خود کو مشقت میں ڈالیں اور ادھر ادھر ٹاپتے پھریں۔ دنیا پہلے ان کی مفتوح تھی' اب 'معمول' ہے۔

ہندی مسلمان' ترکوں وغیرہ کے مقابلے میں کہیں زیادہ قوی تھے بشرطیکہ قوت کو محض جنگی صلاحیت اور دشمن پر تلوار لے کر ٹوٹ پڑنے کی اہلیت تک محدود نہ کیا جائے۔ جنگ جو معاشرے دین کے آگے اس لازمی اور غیر مشروط انفعال سے محروم ہوتے ہیں جو بدلے ہوئے حالات میں بھی ان کی ایمانی وابستگی کو کمزور نہیں ہونے دیتا۔ یہ ہمیشہ غلبے کا راستہ ڈھونڈتے ہیں' خواہ وہ دین کی مخالفت سمت ہی میں ہو۔ مسلمانان برصغیر کے کچھ طبقات میں جو زیادہ تر مسلم اکثریتی علاقوں سے تعلق رکھتے تھے' یہی نفسیات پائی جاتی تھی مگر من حیث القوم رہنمائی کے بیش تر مراکز ان مقامات پر ہونے کی وجہ سے جہاں مسلمان اقلیت میں تھے' زندگی کو دیکھنے کا یہ جبلی انداز فروغ نہ پاسکا بلکہ قوم کے سلسلہ حیات کی ایک مضبوط کڑی کا کردار ادا کرتا رہا۔ اصل میں زندگی صورتوں کے ایک نظام کا نام ہے۔ کسی قوم کے مجموعی مزاج' بنیادی تصورات اور اس کی زندہ ترجیحات کا تعین کرنے کے لیے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ وہ صورتیں ——— ذہنی ہوں یا خارجی ——— کن معانی پر دلالت کرتی ہیں؟ اگر بالفرض ہمیں اپنی زندگی میں اسلام کا کردار دیکھنا ہو تو اسلامی جمہوریہ پاکستان کا آئین کوئی مدد نہیں کرے گا۔ اس کے لیے ہمیں اپنی زندگی کے ترکیبی عناصر کا بغور مطالعہ کرنا ہوگا۔ مثلاً تہذیبی اوضاع' ذہنی سرگرمیاں اور ان کا مرکز' عملی مقاصد اور ان کی طرف پیش رفت کے اسالیب' تصور علم' گھر کا نظام تربیت' معاشرتی آداب' افراد کے مراتب کا تعین کرنے والے معیارات' قومی قیادت کے لیے درکار خصوصیات' تصور جمال' زبان کے ارتقائی مظاہر' طرز تعمیر' علمی و ادبی تحریکات' لوگوں کی وضع قطع' تصور تفریح وغیرہ ——— جانب داری کی ہر انتہا پار کر کے بھی ہم خود کو اس نتیجے پر پہنچنے سے نہیں روک سکتے کہ

اسلام ہماری انفرادی و قومی حیات کی بس انہی سطحوں پر کسی حد تک موجود ہے جو غیر اہم اور ہر لحاظ سے غیر فعال ہیں۔ اقبال نے اپنے زمانے کے انگریزی خواں نوجوانوں کے بارے میں کئی جگہ گفتگو کی ہے۔ وہ ہمارے لیے بہت بامعنی ہے کیونکہ وہی نوجوان ہماری موجودہ صورت حال کے بانی ہیں۔

"موجودہ نسل کا مسلمان نوجوان قومی سیرت کے اسالیب کے لحاظ سے ایک بالکل نئے اسلوب کا ماحصل ہے جس کی عقلی زندگی کی تصویر کا پردہ اسلامی تہذیب کا پردہ نہیں ہے۔ حالانکہ اسلامی تہذیب کے بغیر میری رائے میں وہ صرف نیم مسلمان بلکہ اس سے بھی کچھ کم ہے۔ اور وہ بھی اس صورت میں کہ اس کی خالص دنیوی تعلیم نے اس کے مذہبی عقائد کو متزلزل نہ کیا ہو ــــ اس نے اپنی قومی زندگی کے ستون کو اسلامی مرکز ثقل سے بہت پرے ہٹا دیا ہے ــــ عقلی وادراک کے لحاظ سے وہ مغربی دنیا کا غلام ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کی روح اس صحیح القوام خود داری کے عنصر سے خالی ہے جو اپنی قومی تاریخ اور قومی لٹریچر کے مطالعے سے پیدا ہوتی ہے۔ ہم نے اپنی تعلیمی جدوجہد میں اس حقیقت پر جس کا اعتراف تجربہ آج ہم سے کرا رہا ہے' نظر نہیں ڈالی کہ اغیار کے تمدن کو بلاشرکت احدے اپنا ہر وقت کا رفیق بنائے رکھنا گویا اپنے تئیں اس تمدن کا حلقہ بگوش بنا لینا ہے۔ یہ وہ حلقہ بگوشی ہے جس کے نتائج کسی دوسرے مذہب کے دائرے میں داخل ہونے سے بڑھ کر خطرناک ہے۔ کسی اسلامی مصنف نے اس حقیقت کو مولانا اکبر (الہ آبادی) سے زیادہ واضح طور پر نہیں بیان کیا جو نئی نسل کے مسلمانوں کی موجودہ عقلی زندگی پر ایک نظر غائر ڈالنے کے بعد حسرت آفریں لہجے میں پکار اٹھتے ہیں:

شیخ مرحوم کا یہ قول مجھے یاد آیا
دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے (۱۴)

"مجھے رہ رہ کر یہ رنج وہ تجربہ ہوا ہے کہ مسلمان طالب علم جو اپنی قوم کے عمرانی' اخلاقی اور سیاسی تصورات سے نابلد ہے' بمنزلہ ایک بے جان لاش کے ہے' اور اگر موجودہ صورت حال اور بیس سال تک قائم رہی تو وہ اسلامی روح جو قدیم اسلامی تہذیب کے چند علم برداروں کے فرسودہ قالب میں ابھی تک زندہ ہے' ہماری جماعت کے جسم سے بالکل ہی نکل جائے گی۔" (۱۵)

گرچہ مکتب کا جواں زندہ نظر آتا ہے
مردہ ہے مانگ کے لایا ہے فرنگی سے نفس (۱۶)

جنہیں ہم غلام کہتے ہیں' ان کا تو یہ حال تھا کہ ہر دباؤ اور ترغیب کے باوجود دین کے پورے سٹرکچر کی حفاظت کی۔ اصول تو کجا' انہوں نے اس کے آرائشی عناصر اور ثانوی سطح کے سماجی مظاہر کو بھی جان سے لگائے رکھا۔ اسلام سے' صحیح یا غلط' کوئی بھی نسبت رکھنے والی ہر چیز ان کے لیے دنیا ومافیہا سے بڑھ کر تھی۔ اس معاملے میں ان کی مثال ایک ضدی اور چوکس پاسبان کی تھی جو اپنے زیر نگرانی حدود میں باہر کے کسی شخص کو وہ چیزیں بھی نہیں چھونے دیتا تھا جن کی حفاظت اس کے ذمے نہیں تھی۔ مسلمان' اگر واقعی مسلمان ہے تو اس کا دنیاوی کردار بھی یہی ہوگا۔ مسلمانوں کے جدید تعلیم یافتہ طبقے میں اس نکتے کو سب سے پہلے اکبر الہ آبادی نے سمجھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ ان کے اسلوب کی وجہ سے ہم ان کی بصیرت سے پوری طرح فیض یاب نہ ہوسکے لیکن اس کے باوجود ہمارے قومی طرز احساس میں خاصی گہرائی میں جاکر ان کے اثرات آج بھی موجود ہیں۔ جو مجبوریاں ہمارے لیڈروں سے بار بار اپنے مسلمان ہونے کی وضاحت کرواتی ہیں' ان میں سے کئی اکبر ہی کی پیدا کردہ ہیں۔ سرسید نے ہماری نفسیات میں جس ہولناک دنیا پرستی کا دروازہ کھولا تھا' اسے پہلے ہی قدم پر پوری طرح بھانپ لینے کے باوجود اکبر اپنی بعض تحدیدات کی وجہ سے نسبتاً زیادہ مضبوط بنیاد اور وسیع تناظر میں اس کا سدباب نہ کرسکے۔ انہوں نے خطرے کی گھنٹی ضرور بجائی' مگر اس سے نمٹنے کی راہ نکالنا شاید ان کے دائرۂ کار سے باہر تھا۔ اور باہر ہونا بھی چاہئے تھا۔ ہمیں جس زمین پر ماتھا ٹیکنے کو کہا جارہا تھا' اس کی مزاحمت میں سنجیدگی اختیار کرنا ایک طرح کا مسخرا پن ہوتا——— اور اکبر مسخرے نہیں تھے۔

عمل اور ردعمل کی کوئی تعبیر اگر بفرض محال ہمارے ذہن میں موجود ہے تو فی الوقت اسے نظرانداز کرکے تاریخ کے اصول تبدیلی کو ایک مختلف جہت سے دیکھنے کی کوشش کرنی چاہیے جو محض ایک شخص کی بدولت ہمارے علم اور تجربے میں آئی ہے: لسان العصر اکبر الہ آبادی——— اور وہ جہت یہ ہے کہ عمل و ردعمل کے تقابل کی دو سطحیں ہیں۔ ورائے مظاہر اور مظاہری۔ ورائے مظاہر کی سطح اشیا کے مطلوب تعین کی سطح ہے اور مظاہری جہت میں ان کا موجود تعین کار فرما

ہوتا ہے۔ ایک علم کا دائرہ ہے اور دوسرا حس کا۔ اکبر کے عہد کی صورت حال یہ تھی کہ مغرب اپنی 'دنیا مرکزی' کے ساتھ مسلمانوں کی 'خدا مرکزی' پر محض طاقت کے بل پر حملہ آور تھا۔ وہاں کوئی ورائے مظاہر تقابل موجود نہیں تھا مگر اس کے نتائج ہمارے لیے ورائے مظاہر بھی ہوتے۔ تقابل کی اس دہری نوعیت کا تقاضا تھا کہ ردعمل کی ابتدا بھی مظاہری یا حسی ہو' تاکہ ایک طرف تو یقینی مغلوبیت کے دائرے کو سکیڑنے کی کوشش کی جائے اور دوسری جانب اس کا اثر قومی نفسیات کی اس قوت محرکہ تک نہ پہنچنے دیا جائے جو کسی قوم کے مجموعی طرز احساس کو تاریخ کی فنا کاری سے محفوظ رکھ سکتی ہے یا کسی سازگار مرحلے پر اس کی باز آفرینی بھی کرسکتی ہے۔ اس کا صرف ایک راستہ تھا--- وہی جو اکبر نے اختیار کیا۔ 'جگت بازی' جی ہاں! 'جگت بازی' ان کے شعروں پر سرسید اگر صرف ہنس بھی دیتے تو یہ صورت حال جو آج ہمیں بھگتنی پڑ رہی ہے' شاید پیدا ہی نہ ہوتی' مگر انہیں تو سویلائزڈ بننے بنانے کی دھن لگی تھی اور ایسے حضرات ہنسا نہیں کرتے۔

فاتح اگر مفتوح کی کسی حرکت سے ڈرتا ہے تو وہ اس کی ہنسی ہے' کیونکہ یہ مستقبل کو اس کے لیے متعین نہیں ہونے دیتی' اس کی فتح کو مکمل نہیں ہونے دیتی۔ یہ عمل ہاری ہوئی قوم کے مزاج میں ہزیمت خوردگی نہیں پیدا ہونے دیتا۔ سرسید احمد خان 'متمدن' فاتحین کے قدموں میں بچھی ہوئی جس زمین پر جبہ سائی کا پرخلوص مشورہ دے رہے تھے--- اکبر نے دل لگی کی آڑ میں اسے روند ڈالا--- اس کا نتیجہ ہے کہ روحانی' ذہنی' تہذیبی اور دنیاوی غلامی کی بدترین حالت کی طرف تیزی سے پیش قدمی کرنے کے باوجود کم از کم عوامی سطح پر ہمارے اندر مغرب کے لیے ایک تحقیری رویہ ہنوز موجود ہے' اور ماند پڑنے پر بھی اتنی طاقت ضرور رکھتا ہے کہ اپنا کام نکالنے کے لیے ہمارے سیاسی رہنماؤں کو اسلام سے غیر مشروط وابستگی کا سوانگ رچانا پڑتا ہے۔ یہ الگ بات کہ جب انہیں اس وابستگی کے کم سے کم معیار کی طرف بھی متوجہ کیا جاتا ہے تو جھٹ سے اقبال کو آگے کر دیتے ہیں---- ہمیں ملا کا اسلام نہیں چاہیے' ہم تو بس اقبال کے اسلام کو مانتے ہیں اور اس پر چل بھی رہے ہیں۔ رونے یا ہنسنے کی بات یہ ہے کہ اقبال کے اسلام پر ایمان لانے والے اس گروہ میں شاید چار آدمی بھی اس قابل نہ نکلیں کہ ان کی نظم و نثر کے دو' دو صفحے ٹھیک سے پڑھ کر سنا دیں' سمجھنا سمجھانا تو ایک طرف رہا---

یہ پورا رویہ اقبال کی آڑ لے کر اسلام سے نکلنے کا ہے۔ انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ اس وقت ہمارے پاس ایک اقبال ہی ہے جو ہمارے دینی جذبات کو تحریک دے سکتا ہے اور جس

کے ذریعے ہم عہد جدید میں غلبہ اسلام کی کلاسیکی یا مجازی معنویت کا ادراک کرنے کے قابل ہوئے ہیں۔ اسلام سے بال برابر انحراف کیے بغیر اس کے غلبے کی ہمہ زمانی وسعت کو جدید آدمی کے ذہن کے لیے قابل فہم اور اس کے ارادے کے لیے ممکن الحصول ہدف بنا کر پیش کرنے کا کام' برصغیر میں اقبال سے بڑھ کر کسی نے نہیں کیا۔ اسی لیے اس قوم میں انھیں دین سے اجتماعی اور جذباتی وابستگی کے دائرے میں ایک تقریباً غیر مشروط قبولیت حاصل ہے۔ اقبال ہمارے لیے اور یہ قبولیت ان کے لیے اللہ کا ایک انعام ہے۔ یہ بات اب پاکستانی قوم کی نفسیات کا ایک حصہ بن چکی ہے کہ ہم اقبال کا نام آتے ہی رک جاتے ہیں۔ جو لوگ پچھلے تین سو سال میں واقع ہونے والی انسانی صورت حال کی عالم گیر تبدیلیوں پر نظر رکھتے ہیں' ان کے نزدیک بعض خامیوں کے باوجود ـــــ قومی استحکام اور یک جہتی کے لیے یہ ایک مثبت رویہ ہے۔ ہمارے لیڈر اور روشن خیال اقبالی دانش ور اسی فضا کو اپنے حق میں استعمال کر رہے ہیں۔ انھیں پتا ہے کہ اقبال کے کندھے پر رکھ کر کوئی بھی بندوق چلائی جا سکتی ہے۔ یہ قوم چوں بھی نہیں کرے گی۔ اس بات میں کم از کم مجھے تو کوئی شبہ نہیں کہ تفہیم اقبال کے تقلیدی سے ہٹ کر تخلیقی سطح پر صحیح' موثر اور معروضی راستے نہ نکالے گئے تو یہ قوم اندر سے مرجھا جائے گی۔ مگر یہ بین کس کے آگے بجائی جائے؟

جس دنیا کو سرسید بدلنا اور اکبر محفوظ رکھنا چاہ رہے تھے' وہ خدا' انسان اور کائنات کے بارے میں جن تصورات پر کھڑی تھی انھیں گو کہ عقیدے کے ایک ہر طرف سے مکمل فریم میں بھی رکھ کر دیکھا جا سکتا ہے مگر اس زمانے کے مخصوص جدلیاتی عمل میں سرسید کی تمامتر کوششوں کے باوجود اس کی ایک کیل بھی نہ نکالی جا سکی کیونکہ عقائد اور ان کی تشریح کے معاملے میں مسلمان ایک فطری نظام استناد پر کاربند تھے' یعنی علماء کی طرف دیکھتے تھے ـــــ اس سطح پر سرسید وغیرہ ناقابل التفات تھے ـــــ اس لیے ہم ان تصورات کی الہیاتی اور مابعد الطبیعی اساس سے روگردانی کیے بغیر فی الوقت ان کی تہذیبی' اور پھر ذرا وسعت پیدا کر کے' انسانی جہت پر نسبتاً زیادہ زور دیں گے۔

مسلمانوں کے لیے تہذیب کے معنی کبھی وہ نہیں رہے جو آج کی دنیا میں مروج ہیں۔ جب ہم اسلامی تہذیب کہتے ہیں تو اس کا مطلب ہوتا ہے خدا اور اس کے رسول آخر صلی اللہ علیہ والہ وسلم پر ایمان رکھنے والوں کا مشترک رویہ' طرز احساس' طریق فکر و عمل' تصور کائنات ـــــ اور ان کا ایسا امتزاجی تنوع جو افراد و اقوام کی انفرادیت کا اثبات کرتا ہے مگر انھیں آپس میں

ٹکرانے نہیں دیتا ـــــ یا یوں کہہ لیں کہ دین اپنی پوری تفصیل کے ساتھ ہمارا مجموعی اور مرکزی تجربہ بن کر ہماری تمام داخلی و خارجی نسبتوں کو معنی و صورت' دونوں میں' ایک اصولی سطح پر متعین کر دے تو اس کا اجتماعی و انفرادی جو بھی اظہار ہوگا' "اسلامی تہذیب' کہلائے گا۔ ادیان ماسبق عالم گیر اور ابدی پیغام بنا کر نہیں اتارے گئے تھے اور ان کی حیثیت زیر تکمیل دین کی تھی' لہٰذا ان کا مقصود تشکیل تہذیب نہیں تھا۔ غالباً ڈی ایچ لارنس نے کہیں لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اگر پیسے کو ہاتھ لگا دیتے اور نکاح کر لیتے تو یورپ ـــــ جو کہ مسیحی یورپ ہے ـــــ مارکس اور فرائڈ سے محفوظ رہتا۔ یعنی موجودہ مغربی تہذیب کی دو بڑی بنیادیں وجود میں نہ آتیں۔ وہ یہ بھی بتا دیتا تو اچھا تھا کہ اگر آنجناب' دس بیس بدمعاشوں کا صفایا کر دیتے تو ہٹلر کسی چرچ میں پادری ہوتا ـــــ پتا نہیں اسے معلوم تھا یا نہیں کہ مسلمانوں میں ایک روایت ایسی بھی پائی جاتی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام دنیا میں دوبارہ نزول فرمانے کے بعد تجارت بھی کریں گے اور نکاح و قتال بھی ـــــ غرض عیسائیت کو چھوڑے بغیر اس کی داخلیت کی تلافی کرنے والی یہ تہذیب خاص طور پر مسلمانوں کا جو حشر کر سکتی تھی' حسن ظن کہتا ہے کہ سرسید کو اس کا کوئی اندازہ نہ تھا۔ کیا ستم ظریفی ہے کہ ہندی مسلمان اپنی تاریخ کی جس سب سے بڑی تبدیلی سے لڑ یا بھاگ رہے تھے' اس کا وکیل اعظم اس کی الف بے سے بھی ناواقف تھا۔ اس کی برکت ہے کہ ہماری قومی زندگی کی باگ ڈور آج بھی ایسے ہی وکیلوں کے ہاتھ میں ہے:

امید کیا ہو سیاست کے پیشواؤں سے
یہ خاک باز ہیں رکھتے ہیں خاک سے پیوند
ہمیشہ مور و مگس پر نگاہ ہے ان کی
جہاں میں ہے صفت عنکبوت ان کی کمند
خوشا وہ قافلہ جس کے امیر کی ہے متاع
تخیل ملکوتی و جذبہ ہائے بلند (۱۷)

اس صورت حال میں ایک آدمی کی کمی تھی جو اکبر کے تہذیبی دفاع کی بیش تر جزئیات کو نظرانداز کر کے اس کے دائرے کو ایسی وسعت دیتا جس میں دین کی غیر اجزائی کلیت کو ایک پیغمبرانہ آہنگ میں بیان کیا جاسکتا۔ اقبال وہی آدمی تھے جیسا کہ پہلے بھی کہا گیا کہ اکبر کے ہاں مغربی تہذیب کی دین کش روح کا جو ادراک تھا وہ ہر اعتبار سے بے مثال ہے۔ خود اقبال ایسا

شخص بھی اس پر کوئی اضافہ نہ کرسکا۔ مگر اکبر کی کچھ مجبوریاں تھیں جن کی وجہ سے ان کا موقف درست ہونے کے باوجود ہماری قوم کی انقلاب آمادہ حیات کے تمام گوشوں کا احاطہ نہیں کرسکتا تھا اور تاریخ کی ہمہ گیر اکھاڑ پچھاڑ میں اپنے پاؤں جمائے رکھنے کی کوئی محفوظ جگہ فراہم کرنے سے بڑی حد تک قاصر تھا۔ پھر اس میں مقامیت بھی بہت تھی۔ ان کی باتیں حد درجہ گہرائی اور معنی خیزی کے باوجود' اپنے اسلوب کی وجہ سے انہی لوگوں پر اثر کرتی تھیں جن کا ذہن' طبیعت اور تجربہ ایک خاص تہذیبی ترکیب رکھتا تھا جو اگلی نسلوں میں منتقل نہیں ہوئی۔ ان کے علاوہ ایک کمی اور تھی —— اکبر ہمیں شیطان پر ہنسنے کا حوصلہ تو دیتے ہیں مگر خدا کی عظمت کا احساس نہیں دلاتے۔ ان کے ہاں وہ شکوہ نہیں ملتا جو قوموں میں ایک وسیع تر تاریخی تناظر پیدا کرتا ہے اور زمانہ زوال میں اپنی حالت سے چشم پوشی کیے بغیر واقعی صورت حال سے اوپر اٹھنے کی قوت بخشتا ہے۔ ایسا شکوہ تصور عظمت سے پیدا ہوتا ہے' اور تصور عظمت کا مصداق ہمیشہ قوم کے ماضی میں ہوتا ہے جو کسی مجرد اور خیالی نہیں بلکہ ایک ٹھوس بنیاد پر تاریخ کی اثراندازی سے آزاد ہوتا ہے۔ اکبر ہمیں ماضی کی اس جہت میں بہت دور تک نہیں لے جاتے۔

اقبال نے برصغیر کی مسلم تاریخ کے اس انتہائی اور فیصلہ کن دور پر چھائی ہوئی اکبر بمقابلہ سرسید کی فضا کو یکسر بدل کر رکھ دیا۔ کسی فریق کے ردو قبول میں وقت ضائع کیے بغیر مسائل کو گویا ایک کائناتی اور تقدیری زاویے سے دیکھنا شروع کیا۔ مسلمانوں کے ہر بنیادی تصور کو اس وقت کی دنیا میں مسلمات کا درجہ رکھنے والے خیالات و نظریات سے ملا کر نہیں' ٹکرا کر دیکھا اور اس ٹکراؤ کے نتائج کو صحیح و غلط کا حکم لگانے والے کسی استدلال کے بجائے مفید و مضر یا کارآمد و ناکارہ کا تعین کرنے والے ایک ٹھوس عملی نقطۂ نظر کے ذریعے اپنے حق میں استعمال کیا۔ اقبال کے حامی ہوں یا مخالف اسی جھگڑے میں پھنسے ہوئے ہیں کہ وہ فلاں فلاں سے متاثر تھے یا نہیں —— ان کی بنیادی حکمت عملی پر زیادہ غور نہیں کیا گیا جو اس ارفع مصلحت کے تابع تھی جسے متاثر یا غیر متاثر ہونے کی سپاٹ ذہنی سطح پر رکھ کر نہیں جانچا جاسکتا۔ ڈاکٹر برہان احمد فاروقی اور ہمارے سراج منیر کا یہ موقف بالکل درست ہے کہ اقبال کا مطالعہ ایک ٹھنڈی علمیاتی فضا میں اس طرح نہیں کرنا چاہیے جس طرح ہم فلسفہ پڑھتے ہیں۔ ان کے اکثر نتائج کسی نرے فکری لین دین سے نہیں بلکہ اس زندہ ایمان سے پیدا ہوئے ہیں جو پوری انسانی صورت حال میں اپنے موافق اور مخالف عناصر سے لاتعلق نہیں رہ سکتا۔ جب حالات سازگار تھے' مسلمانوں نے غلامی کی تلخی نہیں چکھی تھی تو اس ایمان نے غزالیؒ میں ظہور کیا اور خود سے

متصادم علمی و عملی رجحانات کی کمر توڑ کر رکھ دی۔ یہ غزالیؒ ہی کے سمندر کی ایک لہر تھی جو عقلیت اور تجربیت کے گھروندے بہا لے گئی پھر جب زمانہ پلٹ گیا اور مسلمانوں نے قومی زندگی کی ہر سطح پر غلامی کے شکنجے کی سختی محسوس کرنا شروع کر دی تو وہ ایمان اقبال میں ظاہر ہوا۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ میں اقبال کو غزالی کے برابر نہیں بٹھا رہا۔ غزالی پوری امت کے امام ہیں۔ وہ نہ ہوتے تو اس امت کے مسلمان رہنے کا ایک بڑا سبب گم ہو جاتا ہے۔ دین میں پورا داخل ہونے کے لیے جس طرح علم کی ذہنی اور عمل کی روحانی و نفسیاتی رکاوٹیں غزالی نے دور کی ہیں، اس کی مثال ڈھونڈنا عبث ہے۔ وہ علم و عمل، دونوں کی انتہا پر تھے۔ ان کی نسبت سے یاد کیا جانا اقبال کے لیے عیب کی نہیں، شرف کی بات ہے۔ اقبال کو جس صورت حال کا سامنا تھا وہ اتنی پیچیدہ تھی کہ ان کے لیے وہ مدلل مگر تحکمانہ نفی و اثبات کا رویہ کم از کم خطبات و مقالات میں اختیار کرنا ممکن نہ تھا جو "تہافت الفلاسفہ" وغیرہ میں نظر آتا ہے۔ اس کے لیے انہوں نے اپنی شاعری کو استعمال کیا۔

فکری عمل کے دوران میں ناگزیر طور پر پیدا ہونے والی مماثلتوں کو بنیاد بنا کر اقبال کو فشطے وغیرہ کا مقلد ثابت کر دینا آسان ہونے کے باوجود ایک قسم کی فریب دہی ہے۔ افکار و تصورات میں تماثل و تخالف کلی ہونا چاہیے نہ کہ اجزائی۔۔۔ مثلاً دو تصورات اپنی اجزائی بنت میں مختلف ہیں مگر کلیت میں یکساں، تو انہیں مماثل تصورات کہا جائے گا۔ اسی طرح اجزائی مماثلت اور کلی اختلاف کی صورت میں وہ مختلف تصورات ہوں گے۔ اقبال اور خاص طور پر مغربی مفکرین میں یہی مناسبت پائی جاتی ہے۔ انسانی ذہن کی ساخت ایسی ہے کہ اس کی سمائی تو غیر محدود ہے مگر اس میں جو کچھ کاٹھ کباڑ بھرا ہے اس کا بہت تھوڑا حصہ قابل ادراک ہے۔ معلوم کی اس قلت کی وجہ سے اس کا مجہول بھی اتنی گنجائش نہیں رکھتا کہ فکر کا عمل تکرار، یکسانی اور ظاہری مماثلت سے آزاد ہو کر ایک انفرادی ندرت پیدا کر سکے۔ اسی لیے ذہن کی وہ صلاحیت جو کلی نوعیت کے تصورات کی تشکیل کرتی ہے، انتہائی محدود ہے۔ اوپر سے زبان کا معنیاتی نظام بھی، جس کے بغیر اس طرح کی ذہنی تشکیلات وجود میں، میں آسکتیں، اس قدر تنگ مگر غیر متعین ہے کہ مدرکات بھی بتمام و کمال بیان نہیں ہو سکتے۔ ان تحدیدات کا ایک اثر یہ ہے کہ انسان حقائق کے معدودے چند تصورات ہی ۔سے مانوس ہے، اور انہی میں چکر کاٹتا پھرتا ہے۔ خطبات کی حد تک اقبال کے ساتھ بھی یہی مسئلہ تھا کہ وہ مروج علمی حدود کو توڑ نہیں سکتے تھے۔ انہیں اپنے زمانے کے تصورات، موضوعات اور مصطلحات کے اندر رہ کر ہی کچھ کام کرنا تھا۔ ان کا بنیادی

مسئلہ یہ تھا کہ تاریخ کے اس موڑ پر کہ جب تمام موثرات زندگی مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل چکے تھے دین کے کائناتی اطلاق کو انسانی فکر و عمل کی ہر سطح پر کیسے بحال کیا جائے؟ اور جدید آدمی کے اولیات اور مسلمات کے ساتھ کوئی غیر مفید تصادم پیدا کیے بغیر اس کی کون سی تعبیر اختیار کی جائے جو تعقل اور تجربے کی خلقی پیش رفت سے ہم آہنگ ہو اور اتنی وسعت بھی رکھتی ہو کہ کائنات میں تغیر مسلسل کے اصول کو اپنی گرفت میں لاسکے؟ —— اس آرزو نے انہیں کئی راستوں پر دور دور کی سیر کروائی۔

اقبال کے تقریباً تمام تصورات ان کی نثر کے ساتھ ساتھ نظم میں بھی بیان ہوئے ہیں، تاہم ٹھیٹھ فلسفیانہ معیارات پر بھی دیکھا جائے تو بیش تر یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ شعر میں آکر ان کے خیالات کی فکری سطح بھی کہیں بلند ہو جاتی ہے۔

مجھے اس بات پر اصرار ہے کہ تصورات اقبال کی ذرست اور زندہ تفہیم کے لیے خطبات وغیرہ کے مقابلے میں ان کا شاعری کا مطالعہ زیادہ مفید اورزیادہ ضروری ہے "Reconstruction" کے اکثر مباحث اور قریب قریب سارا طریق استدلال فلسفے، سائنس اور نفسیات کی موجودہ صورت حال میں اجنبی اور غیر موثر ہوچکا ہے۔ اقبال نے خاص کر ان تینوں سے جو امیدیں باندھی تھیں، ان میں سے ایک بھی پوری نہیں ہوئی اور نہ آئندہ کبھی ہو سکتی ہے۔

مذہب اور مذہبی تصورات، اب کسی انسانی علم کا موضوع نہیں رہے۔ فکری علوم تو ایک طرف اب مذہب بیگانگی کا رویہ ریاضی اور لسانیات تک میں سرایت کرچکا ہے۔ یہاں مجھے ایک بات دہرانے کی اجازت دیجئے کہ ہم جس دنیا کے پڑوس میں رہ رہے ہیں، وہ ہر لحاظ سے انسانی تاریخ کا ایک عجوبہ ہے۔ اقبال جس تغیر سے ایک نیم مشروط موافقت پیدا کرنے کی تلقین کرتے تھے، اس کے معنی بدل چکے ہیں۔

آج تغیر کا مطلب ہے اپنا غیر ہو جانا یعنی کسی بھی معنوی تشخص پر برقرار نہ رہنا۔ اب اس سے قدم ملا کر چلنے کی ناکام کوشش کا بھی نتیجہ اسلام سے باہر نکل جانے کے سوا کچھ نہیں نکلے گا۔ تجربیت، ارتقا، اضافیت، کوانٹم تھیوری اور مساوات ایسے عناصر سے تشکیل پا کر ان کی گرفت سے بھی پھسل جانے والی یہ دنیا ایک منجمد ابھی اور یہیں کی دنیا ہے۔ یہ ابھی۔یہیں اضافی ہونے کے باوجود یا یوں کہہ لیں کہ اسی وجہ سے ایک سادہ معروضیت رکھتا ہے جو اتفاق سے اتنی سادہ ہے کہ ذہن اس سوال سے الجھنے لگتا ہے کہ اس کی کوئی حقیقت بھی ہے یا یونہی ایک التباس ہے

جس نے سب کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے؟ اس سوال کا جواب کچھ بھی ہو' ایک بات بہرحال طے ہے—— سب کچھ بدل گیا ہے! اور یہ ہمہ گیر تبدیلی کسی مرتب و منظم و جودی حرکت سے نہیں پھوٹی۔ ہر انقلاب کا ایک کلی یا جزوی طور پر متروک ماضی اور ایک مطلوب مستقبل ہوتا ہے جن کے حوالے سے اس کی معنویت کا ادراک اور نوعیت کا تعین کیا جاتا ہے۔ یہاں ایسا کوئی حوالہ موجود نہیں—— غالباً اس لیے کہ یہ تبدیلی کسی رد و قبول کا نتیجہ نہیں بلکہ کامل لاتعلقی کا ظہور ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے کس رخ پر متعین کیا جائے' اس کی رفتار کو ترقی یا زوال کے کس پیمانے سے ناپیں؟—— اب چیزوں کو نفی و اثبات کے روزن سے نہیں دیکھا جاتا۔ ان کے ہونے کی ایک حیاتیاتی لہر کو محسوس کر لینا کافی ہے۔ ماننا نہ ماننا' جاننا نہ جاننا' جس آدمی کا مسئلہ تھا وہ شاید مر چکا ہے۔ سارتر کے مجذوب پیغمبر' ژاں ژینے سے پوچھ لیں! یقیناً یہی کہے گا کہ اچھا! وہ نٹ جو 'ہاں' اور 'نہیں' کے دو رسوں پر اترا اترا کے چلتا تھا اور ایک دن سر کے بل نیچے آ رہا!——

'سب صحیح' اور 'سب غلط' کی یہ صورت حال جس کے شکنجے میں دوسروں کی گردن ہی نہیں' ہماری ٹانگ بھی پھنسی ہوئی ہے' اس سے جان چھڑانے کی اگر کوئی صورت ہے تو بس یہ کہ ہم جی لگا کر اقبال کی شاعری پڑھیں اور فنڈا مینٹلزم پر ٹوٹ جائیں۔ اکیسویں صدی میں امید ہے کہ وہ طاقت بھی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جائے گی جس کی بنیاد پر ایک قوم دوسری کو محکوم بناتی ہے۔ وہ وقت زیادہ دور نہیں معلوم ہوتا جب انسانیت کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہوگا کہ صبح سے شام کیسے کی جائے؟ زمان و مکاں کو سکیڑنے اور پھیلانے کی شعبدہ بازی آخر کب تک چلے گی۔ مسلمانوں کو اس وقت کا صبر' ہوش مندی اور ہمت سے انتظار کرنا چاہیے جب مغرب کا آدمی حیوان بھی نہیں رہے گا' مشروم یا کائی بن جائے گا۔ تاریخ کے پہیے کو اتنی تیزی سے گھمانے کا یہی فطری انجام ہے۔ خود ہمارے پاس بھی زیادہ مہلت نہیں ہے۔ مغربی تصور کے مطابق ترقی یا دین؟ یہ فیصلہ ہمیں جلدی کرنا ہوگا۔ اور ہاں! اس 'یا' کو قیامت تک 'اور' نہیں بنایا جا سکتا—— یا سراپا نالہ بن جایا نوا پیدا نہ کر۔

ہمیں جس تبدیلی کی فوری ضرورت ہے وہ حس وادراک کے متداول سانچوں اور تصورات کے موجودہ آفاق میں نہیں سما سکتی۔ ہمیں ہر چیز کے ساتھ ایک بالکل نئے تعلق کی بنیاد ڈالنی ہے تاکہ انسان اور کائنات کی وہ قدیم معنویت بحال ہو سکے جسے مغرب نے مسخ کر کے رکھ دیا ہے۔ تاریخ کے پورے کینوس پر اس نے خیر کا نقطہ تک نہیں چھوڑا جسے ایک موجود حوالہ بنا کر صحیح

اور غلط کے اس ٹھوس امتیاز تک پہنچا جا سکے جس کے بغیر انسان اگر واقعی انسان ہے تو سانس بھی نہیں لے سکتا۔

قومی زندگی کے طول و عرض اور اس کے مستقبل کا تعین کرنے کے لیے انسان کو دو صلاحیتیں بخشی گئی ہیں۔ تاریخی بصیرت اور تقدیری بصیرت ـــــ جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کی خوش نصیبی ہے کہ انہیں کم و بیش ایک ہی زمانے میں دونوں طرح کے صاحبان بصیرت میسر تھے۔ تاریخی بصیرت چونکہ سبب و اثر کے عالمگیر ضابطے سے متعلق ہوتی ہے لہٰذا اس کے نتائج ہاتھ کے ہاتھ سامنے آجاتے ہیں اور ایک محدود دوران میں اس پر کوئی حکم لگانا آسان ہوتا ہے ـــــ لیکن تقدیری بصیرت، فعل و انفعال کی کائناتی اصل کے وجدان سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کی نتیجہ خیزیوں کا ظہور دھیرے دھیرے اور ایک ایک کر کے ہوتا ہے ـــــ مگر اس کا کیا کیا جائے کہ ہمیں چند فضول بلکہ مہلک تعصبات نے ایسا گھیر رکھا ہے کہ پاکستان کی محض سیاسی تعبیر ہمارا کابوس بن گئی ہے۔ ہم نے اسی کو فضیلت و دنائت کا ایک حتمی معیار بنا کر اس زمانے کے تمام لوگوں پر نافذ کر رکھا ہے۔ نتیجتاً" ملت اسلامیہ کے بہترین عناصر کا ایک بڑا حصہ اس ہٹ کی بھینٹ چڑھ گیا اور بحیثیت امت ہماری تشکیل کے اکثر لازمی اجزا معطل ہو کر رہ گئے۔ اس مریضانہ رویے کا علاج بھی اقبال کے پاس ہے مگر ہمیں ان کے ہاں وہ اصول تالیف و تطبیق نظر ہی نہیں آتا جس کی بنیاد پر انہوں نے ملت کو انتشار سے بچانے کے لیے اس کے متضاد عناصر کو بھی یکجا کر دیا تھا۔

خیر۔ بات یہ ہو رہی تھی کہ خطبات وغیرہ میں شعور کی جس ساخت کو معیار بنا کر انسانیت کے بنیادی تصورات کو Objectify کرنے کی سعی کی گئی ہے، وہ اب اتنی ٹوٹ پھوٹ چکی ہے کہ تعمیر نو تو دور کی بات ہے، اسے فرض بھی نہیں کیا جاسکتا۔ کبھی Op Art یا Minimal Art کے نمونے دیکھیں تو جدید 'شعور' کی بناوٹ کا اندازہ ہو جائے گا۔ البتہ شاعری میں اقبال تصورات کی Objectification اور انہیں Clinically ثابت کرنے سے اتنی دلچسپی نہیں رکھتے۔ یہاں ان کی آواز وجود کی ان ساکن گہرائیوں تک پہنچتی ہے جہاں 'لازمانی' حقائق اپنی فوق استدلال جہت کے ساتھ ایک دائمی محرک کے طور پر موجود ہیں۔ دیگر موجودات کے برعکس انسان کا اصول حرکت 'سکون' ہے۔ بدیں سبب اس کے لیے تغیر کے بس وہی معنی نہیں جو فطرت میں کارفرما ہیں، کیونکہ یہ فقط زمانے کے واقعاتی بہاؤ کا نتیجہ نہیں ہے۔ انسان اپنی اس خصوصیت کی وجہ سے بدلنے یا نہ بدلنے کا فیصلہ کرسکتا ہے اور تاریخ کے سارے عمل کو کسی غیر متغیر مظہر کے تابع

رکھنے پر قادر ہے۔ اس قدرت کا استعمال تغیر کی واقعیت کو نہیں بدلتا بلکہ اس کی حقیقت کو متعین اور محفوظ رکھتا ہے جو اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ ایک ہی معنی کا مختلف صورتوں میں سفر ہے۔ "تشکیل" کی بات تو نہیں کرتا لیکن شعر میں اقبال نے تغیر کو اسی مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ وہ واقعی بہت بڑے آدمی تھے۔ مانا کہ ہماری شعری روایت میں کئی نام ان سے بڑے ہیں مگر عطار اور رومی کے بعد ایسا کوئی شخص نظر نہیں آتا جو کائنات میں انسان کی مرکزیت کا ایسا شعور اور ایسا تجربہ رکھتا ہو جو اقبال کی شاعری میں ایک ایسی قوت کے ساتھ موجود ہے جو تاریخی عروج و زوال کے کسی بھی مرحلے پر قومی زندگی کو اس کی حقیقی ہیئت سے منقطع نہیں ہونے دیتی۔ عطار اس ہیئت کے سماوی و روحانی پہلو کے نمایندار ہیں اور اقبال ارضی و نفسی رخ کے ـــــ رومی حرف آخر کی طرح دونوں طرف موجود ہیں۔

عقیدے اور زندگی کے تعلق کی حقیقی نوعیت کا احاطہ کرنے کا دعویٰ کیے بغیر محض سہولت فہم کے لیے 'تصور و تصدیق' کی مثال دی جاسکتی ہے۔ زندگی' تصدیقات کے ایک دہرے سلسلے سے عبارت ہے' عقلی اور حسی' لیکن زندگی چونکہ خود تصور وجود کی حسی تصدیق ہے لہٰذا عقلی مصداقات اس میں خود شعوری کی وہ جہت تو پیدا کر دیتے ہیں جو ارادہ' حرکت اور عمل کے زاویوں میں توازن قائم کر کے اس مثلث کی شکل دیتی ہے جس کے تینوں سرے خدا' کائنات اور انسان کے ماورائے طبیعی تعلق کے بے شمار پہلوؤں کی نشان دہی انھیں محدود کیے بغیر کرتے ہیں۔ لیکن حیات کی بنیادی ساخت کے اعتبار سے اس کے اکثر فوری محرکات عقلی نہیں' حسی ہیں۔ تصور یعنی عقیدے کی حسی تصدیق کے حصول کے بغیر اس کا معنوی یا مابعد الطبیعی کمال تو اپنی جگہ رہتا ہے مگر زندگی اپنے پورے میکنزم سمیت اس سے کوئی نسبت نہیں پیدا کر پاتی۔ جیساکہ عیسائیت کے ساتھ ہوا۔ عقیدۂ الوہیت مسیح کے مابعد الطبیعی مضمرات کے جائزے کا تو یہ موقع نہیں' البتہ حقائق کو تجربی سطح پر گھسیٹ لانے کا رجحان' مادہ و روح کی دوئی کا تصور' چیزوں کی طبیعی اصل کھوجنے کا داعیہ' فطرت کو وحی اور نظام کائنات کو معجزے کی جگہ دے کر انسان کی تمام صلاحیتوں کو انھی میں کھپا دینے کا جنون اسی عقیدے کے بالواسطہ مظاہر ہیں۔ آج دنیا جس 'وجودی کفر' میں بدل چکی ہے' اس کی جڑیں اسی زمین سے پھوٹی ہیں۔ عیسائیت نے آدمی کی حقیقی مسئولیت سے روگردانی کر کے زندگی کے عروج و زوال اور اس کے نظام اسباب و نتائج کو انسان کی عبودی گرفت سے ہمیشہ کے لیے نکال دیا ہے۔ نتیجہ" انسانی مجبوری و مختاری' علم و لاعلمی' نقص و کمال اور ترقی و تنزل کے تمام حدود اسی دنیا میں سما کر رہ گئے۔ ظاہر ہے جو دین توبہ' یعنی

حق کی طرف لپکنے کے تصور سے تقریباً خالی ہو' اس کے نظام بندگی میں جو خلا ہو گا سو ہو گا' دنیاوی دائرے میں بھی اس کی یہ کمی انسان کو خدا کے' اور کائنات کو انسان کے اختیار سے خارج تو کیا کہیں' محروم کر دیتی ہے۔ توبہ' عمل کو اس کی افقی سطح سے بلند کر کے ایک کلیتہ" مثبت نتیجہ خیزی سے واصل کر دیتی ہے۔۔۔ جس کا' آج کی زبان میں' نفسیاتی اثر یہ ہوتا ہے کہ دنیاوی نتائج بلکہ خود دنیا انسان کی نظر میں ناگزیر ہونے کے باوجود ثانوی ہو جاتی ہے اور ناموافق سے ناموافق حالات میں بھی اس کے قدم جمے رہتے ہیں۔ اس طرح کوئی بھی فعل یا خیال کسی خارجی یا نفسی تقاضے سے نہیں' بلکہ اس غیر مشروط اطاعت سے پیدا ہوتا ہے جو انسانی ارادے کی اصل ہے۔ یہاں اگر "اقوال زریں" کا اسلوب اختیار کرنے کی اجازت ہو تو میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ توبہ' آدمی کے فطری نقص سے رونما ہونے والا کمال ہے۔

اسلام سے پہلے سب ادیان انسان کی ضروریات کو ملحوظ رکھ کر نازل ہوتے رہے۔ مگر اسلام کی صورت میں پہلی اور آخری بار خدا نے پوری تفصیل سے اعلان کیا کہ خود وہ کیا چاہتا ہے۔ ہمارا فنڈا مینٹلزم اسی مفصل مرضِ حق پر لبیک کہنے کا نام ہے۔ لیکن ہمارے دل میں ایک چور چھپا بیٹھا ہے جس نے ہمیں ڈرا رکھا ہے کہ اسلام' زندگی پر جو قیود لگاتا ہے انھیں قبول کر کے ہم ترقی کی دوڑ سے باہر ہو جائیں گے۔ محفوظ راستہ یہی ہے کہ ایمان تو اسلام پر رکھو مگر عمل پر اس کی پرچھائیں بھی نہ پڑنے دو' ورنہ ہم ادھر حلال و حرام کے چکر میں پڑے رہ جائیں گے اور ادھر دنیا کہیں سے کہیں پہنچ جائے گی۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا' ہر ترقی یافتہ یا ترقی پذیر قوم میں ایک چیز مشترک ہے: لادینی۔ ہم فی الحال کج دار و مریز میں پڑے ہوئے ہیں۔ یہاں بھی اقبال ہماری مدد کو حاضر ہیں۔ انہوں نے فرمایا تھا کہ اجتہاد کرنا چاہیے' سو اب ہم قومی زندگی میں ہر دینی قدر' مذہبی موقف اور روحانی طرز احساس کو معطل کر کے اجتہاد کریں گے جس میں جامد فقہ پرستی کے بجائے متحرک حقیقت پسندی کو اپنا رہ نما بنائیں گے۔

علامہ نے اجتہاد کو اسلام کے اصول حرکت سے تعبیر کیا تھا۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ اجتہاد اس روح اطاعت کا عملی ظہور ہے جو کسی بھی خارجی تغیر کے رو و قبول میں کبھی عاجز نہیں ہوتی۔ اس کی حرکت کا رخ لازماً اس کمال کی طرف ہو گا جس کا تعین انسان نے نہیں' خدا نے کیا ہے۔ آج جو لوگ اجتہاد کی رٹ لگائے ہوئے ہیں' کیا وہ بھی ایسا ہی سمجھتے ہیں یا ایسا سمجھنے کے قابل ہیں؟۔۔۔ اسلام سے عملی تعلق کے تقریباً فقدان نے انھیں یہ موقع فراہم کر دیا کہ اقبال کو' جو ہماری جذباتی کمزوری ہیں' دین کی پوری روایت کے مقابلے میں کھڑا کر کے اس کی تحقیر کی

جائے۔

اوپر تصور و تصدیق کے حوالے سے ہونے والی گفتگو سے ملا کر دیکھیں تو ان کا منصوبہ سمجھ میں آجاتا ہے۔ قرآن و سنت اور ان کی سند پر متعین ہونے والے اوضاع و اطوار، عملی زندگی میں ان تصدیقات کا مرتبہ رکھتے ہیں جو مستقل ہیں اور کسی ایسے نظام حرکت و تبدیلی کو قبول نہیں کرتے جو ان کی نسبت اور دلالت کا رخ بدل دے۔ اس جملے میں ذرا مابعد الطبیعی رنگ آگیا ہے جس سے ہم فی الحال گریز کرنا چاہتے ہیں۔ یوں کہنا چاہیے تھا کہ عمل اور اس کی صورتیں، ایمان کی تصدیقات ہیں۔ ویسے تو تصور، صورت اور تصدیق، معنی سے مناسبت رکھتی ہے مگر چونکہ ہم اصطلاح کے پابند ہو کر گفتگو نہیں کر رہے لہٰذا یہاں بھی کسی قدر آزادی سے کام لیتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایمان، معنی ہے اور عمل، صورت۔ جس طرح صورت کا جواز معنی سے مشروط ہے، اسی طرح عمل کا ایمان سے۔ ایمان، شعور کی اور عمل، ارادے کی عمیق ترین سطح پر خدا سے تعلق رکھتا ہے۔ کسی اسلامی معاشرے میں بگاڑ پیدا کرنے کا ایک راستہ تو یہ ہے کہ ایمانیات میں براہ راست تحریف کر دی جائے، مگر اس میں مفت کی سردردی بہت ہے اور جنونی بنیاد پرستوں کا ڈر الگ جی دہلائے رکھتا ہے۔ لہٰذا آسان اور محفوظ طریقہ یہ ہے کہ نیچے سے اوپر تک اعمال کا پورا ڈھانچا بدل کر ان کی تمام صورتوں کو ایسا بنا دیا جائے جو کسی بھی پہلو سے اپنے حقیقی معنی (یعنی ایمان) پر دلالت نہ کریں۔ پہلی ضرب سنت پر لگائی جاتی ہے جس کی بنیاد پر مسلمانوں کا ظاہر و باطن متعین ہوتا ہے۔ ہمارے یہاں یہی ہو رہا ہے۔ آج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کوئی ایک سنت بھی معاشرے میں اور خاص طور پر اس کے مقتدر طبقات میں، زندگی کی بنیادی قدر یا محرک کی حیثیت سے موجود نہیں ہے۔ چند ظاہری سنتیں اکا دکا حلقوں میں پائی تو جاتی ہیں مگر وہ حلقے بالکل غیر موثر بلکہ نشانہ تحقیر ہیں۔

اس وقت تو آدمی دنگ ہی رہ جاتا ہے جب ایسے دعوے سننے کو ملتے ہیں کہ ظاہری سنتیں وقتی اور اضافی نوعیت کی تھیں، ہم معنوی سنتوں پر عمل پیرا ہیں۔ اس کار تیزی منطق پر تو ہنسا بھی نہیں جا سکتا۔ اس معاشرے میں ظاہر ہے یہی کچھ ہوگا جہاں یہ عالم ہو کہ جو شخص سورہ فاتحہ بھی اٹک اٹک کر پڑھتا ہے، وہ رازیؒ و غزالیؒ کے منہ آنے لگتا ہے۔ یہ سب دیکھ کر "The Bolcony" کا بشپ بہت یاد آتا ہے۔ جب پہلا فوٹو گرافر اس سے کہتا ہے:

"Get set for prayer, because the world ought to be bombarded with the picture of a piousman."

تو وہ ـــــ نہیں بلکہ پورا مکالمہ ہی دیکھ لیجئے' مختصر سا ہے:

"THE BISHOP (without moving): In fervent meditation!

FIRST PHOTO GRAPHER: Right, fervent. Get set.

THE BISHOP (ill at ease): But..... How?

FIRST PHOTOGRAPHER: Dont you know how to compose
Yourself for prayer? Okay, facing
both God and the comera. Hands
together. Head up. Eyes down.
That's the Classical pose.......

THE BISHOP (kneeling): Like this?

FIRST PHOTOGRAPHER (looking at him with curiosity):
That's it .....(He looks at the camera)
No, Your'es not in the frame.....
(Shuffling on his knees, THE BISHOP
Places himself in front of the camera) Okay.(۱۸)

جب بھی کسی روشن خیال اسلام کے داعی کو دیکھتا ہوں' دماغ ایک زور دار گونج سے جھنجھنا اٹھتا ہے:

"FACING BOTH GOD AND THE CAMERA"

ع ہم خدا خواہی وہم دنیائے دوں

اکیسویں صدی کا دروازہ ہمارے سامنے ہے۔ اس کی چوکھٹ پر سوئل بیکٹ یا آئی نسکو کا کوئی کردار سر کے بل کھڑا ہے اور بڑی پروقار آواز میں ہم سے خطاب کر رہا ہے: "اس دروازے کی کنجی میرے پاس ہے۔ آپ کے لیے ضرور کھولوں گا۔ بس ایک شرط ہے ـــــ ترقی کرنی ہوگی! کیونکہ اس طرف جھینگروں کی ابدیت کا آغاز ہوتا ہے۔ لہٰذا وعدہ کریں کہ آپ میری کوئی بات نہیں مانیں گے حالانکہ آپ میری ہر بات مانیں گے۔ مگر پہلے یہ وعدہ کیجئے کہ آپ کوئی وعدہ نہیں کریں گے ـــــ"

دور کہیں ایک آواز بلند ہو رہی ہے جسے سنا نہیں جا سکتا۔ "تو ہے' تجھے جو کچھ نظر آتا ہے'

نہیں ہے۔ جو کچھ نظر آتا ہے، نہیں ہے!"

حواشی

۱۔ بال جبریل، کلیات اقبال (اردو)، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۵۰ / ۳۷۴

۲۔ مضامین اقبال ص ۶۸

۳۔ بندگی نامہ زبور عجم، کلیات اقبال (فارسی)، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۱۱۶ / ۳۶۰

۴۔ بانگ درا، دریوزہ خلافت، ص ۲۶۵ / ۲۸۱

۵۔ ضرب کلیم، امید، ص ۱۲۲ / ۶۲۲

۶۔ بال جبریل، ص ۹۰ / ۳۸۴

۷۔ بانگ درا، مسلم، ص ۲۰۸ / ۲۲۴

۸۔ ایضاً، خضر راہ، ص ۲۷۸ / ۲۹۴

۹۔ ارمغان حجاز، بڈھے بلوچ کی نصیحت بیٹے کو، ص ۲۲ / ۱۴۷

۱۰۔ اسرار خودی، ص ۴۲ / ۵۸

۱۱۔ ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر، مضامین اقبال، ص ۹۰-۹۱

۱۲۔ ایضاً، ص ۹۵

۱۳۔ ایضاً، ص ۹۸

۱۴۔ ایضاً ص ۹۲-۹۷

۱۵۔ ایضاً ص ۹۷

۱۶۔ ضرب کلیم، محراب گل افغان کے افکار، ص ۱۸۲ / ۶۸۴

۱۷۔ ایضاً۔ سیاسی پیشوا، ص ۱۶۸ / ۶۶۸

www.IqbalCyberLibrary
All rights reserved
©2002-2006

اقبال اکادمی پاکستان، لاہور کی نئی پیش کش

براشتراک بزمِ اقبال، لاہور

کُلّیاتِ اِقبال

اُردو

سستا ایڈیشن

(نیوز پرنٹ)

اغلاط سے پاک ، معیاری کتابت

مضبوط جلد ، دیدہ زیب ٹائیٹل

قیمت صرف ۴۵ روپے

(تاجرانہ رعایت ۲۵ فیصد)

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006